احمد ندیم قاسمی

"......... میں ادب اور فن کی شاہراہ کا ایک مسافر ہوں۔ بہت دور کا سفر کرنے کے ارادے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکا۔ زندگی کا حسن اور کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت۔ یہ اور بے شمار باتیں ابھی میرے ذہن میں پک رہی ہیں۔ تکمیل کا دعویٰ فن کی آخیر نہیں، فن کار کی موت ضرور ہے..........."

میں اپنی زندگی کے موٹے موٹے واقعات کو اتنی بار دُہرا چکا ہوں کہ اب بار بار انہی کی تکرار بھدی معلوم ہوتی ہے۔ اپنے قلم سے اپنے حالاتِ زندگی کبھی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے مگر یہ تفصیل سوانح نگاری وسعت چاہتی ہے اور اس کے لیے مہینوں کی فرصت چاہیے جو ان دنوں ناپید ہے، البتہ میں آپ بیتی کے ضمن میں اپنی چند یادیں اور چند محسوسات پیش کیے دیتا ہوں جن کی میری زندگی سے وابستگی عیاں ہے۔ محسوسات کا یہ مجمل تذکرہ تسلسل سے محروم نہیں۔

میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کے افراد اپنی روایتی وضع داری نباہنے کو ریشم تک پہنتے تھے اور خالی پیٹ تک سو جاتے تھے۔ بقول غالب ؎

خوں خوردنم نہفتہ، دمی خوردن آشکار

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسے جانے سے پہلے میرے وہ آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دُکھ پر بہہ نکلتے تھے، لیکن میرے لباس کی صفائی، میرے بستے کا ٹھاٹ اور میری کتابوں کی "گیٹ اَپ" کسی سے کم نہ ہوتی تھی۔ گھر سے باہر احساسِ برتری طاری رہتا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے چور ہو جاتے تھے جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے۔ پیاز یا سبز مرچ، یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت، زندگی بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی۔ اور جب میں اپنے ہی خاندان کے بچوں میں کھیلنے جاتا تھا تو آنکھوں میں ڈر ہوتا تھا اور دل میں غصّہ۔ خاندان کے باقی سب گھرانے کھاتے پیتے تھے۔ زندگی پر ملمع چڑھائے رکھنے کا تکلف صرف ہمارے نصیب میں تھا۔ والد گرامی پیر تھے۔ یادِ الٰہی میں کچھ ایسی استغراق کی کیفیتیں طاری ہونے لگیں کہ مجذوب ہو گئے۔ اور جن عزیزوں نے ان کی گدی پر قبضہ جمایا، انھوں نے ان کی بیوی، ایک بیٹی، دو بیٹوں اور خود اُن کے لیے کل مبلغ ڈیڑھ روپیہ ماہانہ (نصف جس کے بارہ آنے ہوتے ہیں) وظیفہ مقرر کیا۔ تین پیسے روزانہ کی اس آمدنی میں اماں مجھے روزانہ ایک پیسہ دینے کے بجائے میرے آنسو پونچھ لینا زیادہ آسان سمجھتی تھیں اور آج جب میں اپنی نظموں اور افسانوں کے معاوضے کا کچھ حصہ ہر مہینے ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں[1] تو وہ سمجھتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ یہ رقم تو جب بھی تھی، مگر وہ آنسو میرے اپنے آنسو تھے۔ اب جو سوچتا ہوں تو یہ وہ آنسو ہیں جنھیں میں یا ہم دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں تسلّی کر دیتی تھی کہ گھرانے کی عزت پر پانی نہ پھر جائے۔

گھرانے کی اس عزت کے احساس نے مجھے وقت سے پہلے حساس بنا دیا۔ اور ممکن ہے اسی گداز نے مجھے فن کار بنایا ہو۔ اگر بچپن میں مجھے ماں کی محبت نہ ملتی تو ممکن ہے آج میں نہایت خطرناک کلبی اور قنوطی ہوتا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ جب ہم بہن بھائی اپنی اماں کا ہاتھ بٹاتے۔ وہ چرخہ کاتتیں اور ہم پونیاں بناتے۔ وہ چکی پیستیں اور ہم مل کر گیت گاتے، وہ کوٹھے کی لپائی کرتیں اور ہم سیڑھی سے چپکے کھڑے رہتے۔ بہرحال جب ہم سب اکٹھے

---

[1] افسوس کہ اب وہ ہم میں نہیں۔

ہوتے (والدِگرامی ۱۹۲۴ء میں انتقال فرما گئے تھے) اور بارش ہونے لگتی تو اماں دہلیز کے پاس بیٹھ جاتیں۔ ہم تینوں اُن کے آس پاس گھس جاتے۔ باہر آنگن میں بلبلے اَن گنت گنبدوں کا فرش بچھاتے اور آنگن کی بیریوں کے پتے اُڑتے ہوئے ہمارے پاس آ جاتے اور باہر گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے پرنالوں کے نیچے نہاتے اور چلاتے تو اماں ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتیں اور روتیں، اور بڑے دُکھ سے آپ ہی آپ کہتیں "بوند بوند کے ساتھ فرشتہ اترتا ہے، اے پاک فرشتو! خدا کے دربار میں جا کر مجھ دُکھیا کی طرف سے عرض کرو کہ میں نے تو جو دُکھ بھوگے سو بھوگے ان میرے بچوں کو کوئی دُکھ نہ دینا۔ میں نے انھیں بڑی مشکل سے پالا پوسا ہے۔ یہ پڑھیں لکھیں، نیک اور لائق بنیں اور دنیا میں نام پیدا کریں۔ انسان کی قسمتوں کے کانٹوں کو پھول بنا دے، اور یہ نہ ہو سکے تو یہ کانٹے میری قسمت میں لکھ دے۔ یہ بچے میرا اثاثہ ہیں، یہ بچے میرا غرور ہیں۔ ہاں تو سب تیرا ہی ہے پر تو نے مجھے یہ مال عطا فرمایا ہے تو بس اتنا کر کہ میں ان کا دُکھ نہ دیکھوں۔ بوند بوند کے ساتھ فرشتہ اترتا ہے اور میں بوند بوند کو پکار رہی ہوں۔ میری پھٹی ہوئی پوروں اور گھسی ہوئی ایڑیوں کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے یا ربّ العالمین!" پھر وہ زیرِ لب کوئی آیتِ کریمہ پڑھتیں اور ہم تینوں پر "چھو" کرتیں۔ اور یہ "چھو" ہوتے ہی زندگی کی ڈالیاں پھولوں سے لد جاتیں۔ مہکاروں اور چہکاروں کا ایک طوفان امڈ پڑتا اور ہم موسلا دھار بارش میں ناچتے کودتے اپنی بیریوں کے بیر چُننے بھاگ جاتے۔ آپا پکارتیں "کیڑا ہے بیر میں!"

اور مَیں کوں کوں احمد شاہ ناچتے ہوئے اپنی بھدّی آواز میں گاتا۔

"کیڑا ہے بیر میں

دانہ ہے ڈھیر میں

رتی ہے سیر میں

کھا جاؤ"

"تم اصل میں میراثی ہو" بھائی جان کہتے "تمھیں تو ہم نے رحم کھا کر اپنے گھر میں رکھ لیا ہے۔ تمھیں ایک روز چیل پنجوں میں دبائے اڑائے لیے جا رہی تھی ابا کو رحم آ گیا۔ چیل سے چھین کر تمھیں اپنے ہاں ڈال لیا، پر جب سے تم نے بولنا سیکھا ہے سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم "ڈھاڈی" ہو کوئی سی بات کرو اس کا گانا بنا لیتے ہو سوتر!"

"گانا گا لیتے ہو سوتر

کھانا کھا لیتے ہو سوتر

پھانا پھا لیتے ہو سوتر

دسانا دسا لیتے ہو سوتر

ٹھانا ٹھا لیتے ہو سوتر"

یہ کھیل رو جبھی رکتی جب بھائی جان میری گھنٹی تاک کر میری موٹی سی ناک پر مارتے اور میں ایک دردمند فریادی بن کر اماں کے حضور اپنی بے گناہی ثابت کرنے چلا جاتا۔

مجھے زندگی میں بے پناہ محبت میسر آئی ہے۔ بھائی کی محبت، بہنوں کی محبت، محبوبہ کی محبت، دوستوں کی محبت، میری ادبی کاوشوں کو سراہنے والوں کی محبت، لیکن ماں کی محبت کا میں اس لیے سب سے زیادہ سپاس گزار ہوں کہ اس محبت نے مجھے تڑپنا سکھا دیا۔ اگر میرے ادب میں PATHOS کا کہیں وجود ہے تو یہ میری اماں کی دین ہے۔ اور اگر میں انفرادی دکھ کے حصار سے نکل آیا ہوں تو یہ بھی اماں ہی کی دین ہے۔

نو برس کی عمر میں مجھے اماں سے الگ ہو کر تعلیم کے سلسلے میں کیمبل پور جانا پڑا۔ چچا جان وہاں سول آفیسر تھے۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بعض سنسان دوپہروں کو ہم دونوں بھائی ڈرائنگ روم کے صوفوں پر آ کر بیٹھ جاتے اور رو رو کر اماں کی باتیں کرتے۔ پھر اچانک بھائی جان کو یاد آ جاتا کہ وہ مجھ سے دو برس بڑے ہیں، وہ میرے آنسو پونچھتے، مجھے تسلیاں دیتے۔ مجھ پر زیادہ رقت طاری ہوتی تو غصے بھی ہو جاتے، پیٹ بھی ڈالتے۔ مگر اتنی ہی جلدی بھائی جان نے ایک اتوار کو مجھے اپنے پاس بلایا: "شاہ ذرا ادھر تو آؤ!"

میں ان کے پاس گیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے تھے اور ہر طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ "پلنگ پر آ جاؤ"۔ میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"شاہ!" انھوں نے کہا۔ "اماں یاد آ رہی ہیں، اس لیے آؤ روئیں۔"

"چلئے، شروع کیجئے۔" میں نے کہا۔

وہ بھرے بیٹھے تھے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے زار زار ان کا ساتھ دیا۔ اور جب ہم خوب رو لیے تو انھوں نے میرے آنسو پونچھے اور بولے "بس اب جی ہلکا ہو گیا۔ ہو گیا نا!"

"ہو گیا!" میں نے کہا۔ اور ہو بھی گیا تھا سچ مچ۔

سو میری زندگی پر سب سے عظیم اثر میری اماں کا ہے۔ میرے آنسو جنھیں میں اب اتنے جلد بہنے نہیں دیتا۔ اب میں اپنے قلم اور اپنے عمل سے جی ہلکا کر لیتا ہوں۔ اب جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دنیا کی بیشتر ماؤں نے اپنے بچوں کے لیے توے کی کالک سے روٹی بنائی ہے اور بوند بوند کے ساتھ اترتے والے فرشتوں کو اپنے بچوں کے تحفظ کا واسطہ دیا ہے، اور جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے جیسے کروڑوں بیٹوں نے ایک پیسے کے حصول میں ناکامی کے دکھ پر آنسو بہائے ہیں اور ماؤں کی آغوش میں منہ چھپا کر روئے ہیں، جب میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں کہ میں دھرتی کا بیٹا ہوں، دھرتی سب کی ماں ہے، تو میرے احساسات میں تموج نمایاں ہوتا ہے۔ میرے قلم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور میں ارتقائے حیات کی رفتار کی تصویریں اپنے شعروں اور کہانیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو بالکل ایسی آسودگی محسوس ہوتی ہے جیسے ماں بیٹے سے کہے کہ بیٹا یہ میری ایڑی سے کانٹا تو نکال دو بیٹا۔ اور بیٹا کانٹے کو نکال کر اور سوئی کی نوک پا اپنی ہتھیلی پر رکھ کر زبانِ حال سے کہے کہ آج میں نے ایک بہت بڑی عبادت کی ہے۔

میں جب اپنے بچپن کا تصور کرتا ہوں تو ماں کے بعد جو چیز میرے ذہن پر چھا جاتی ہے وہ حسنِ فطرت ہے۔ یقیناً میں نہیں کہہ سکتا کہ مظاہرِ فطرت سے موانست کا یہ جذبہ کب، کیسے اور کیوں پیدا ہوا۔ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ جب بھی میں اپنا ماضی یاد کرتا ہوں تو لہلہاتے ہوئے کھیتوں، امڈتے ہوئے بادلوں، ڈھلی ہوئی پہاڑیوں اور چکراتی، بل کھاتی اور قدم قدم پر پہلو بچاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی ایک دنیا میرے

ذہن میں آباد ہو جاتی ہے۔ بہیکڑ کے پھول کی جڑیں مٹھاس کا موتی، لانبی لچکتی گھاس کی چوٹی پر جانے کی کوشش میں چیونٹی سے بھی کہیں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی استقامت، چٹختی ہوئی چٹانوں کی جھریوں میں سے پھوٹتے ہوئے جنگلی پھولوں کے پودے، گھنی چراہیوں کے سائے میں دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو، دور نیلے پہاڑ کے دامن میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی جھیل پر سورج کی کرنوں کی سڑک۔ بادل کی گرج کے ساتھ تانبے کی چادروں کی طرح بجتے ہوئے پہاڑ، مکی کے بھٹوں کے لانبے لانبے سنہرے بالوں میں مکی کی مہک، یہ اور دوسری تفاصیل جو کبھی کبھی میرے افسانوں اور شعروں کا پس منظر بن جاتی ہیں، میری زندگی کے اسی دور کا جمع کیا ہوا اثاثہ ہے جب میں وادیوں اور گھاٹیوں میں اکیلے گھومنے نکلتا تھا۔ یا اپنے میلے کپڑوں کی پوٹلی لیے اونچی پہاڑیوں پر پیالوں کے تالابوں میں کپڑے دھونے جاتا تھا، یا بعد میں ساون یا میانوالی یا خوشاب کے دور دراز ریلوے اسٹیشنوں پر میری منزل قرار پائے اور سناٹے میں لپٹی ہوئی راتوں کو اونٹ کی گھنٹی یا خچر کے ٹاپوں نے چونکا چونکا دیا۔ اس وقت میں بادل کی گرج سے بے طرح ڈرتا تھا۔ بجلی کے شکارے کے ساتھ ہی میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا اور روتی آواز میں بھائی جان سے کہتا "لالہ! اب بادل گرجے گا؟" — "ہاں!" وہ کہتے۔

"پھر؟" میں پوچھتا۔ اور پھر یہ گرج کسی نہ کسی طرح میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا ہی جاتی۔ اور میں خوف زدہ ہو کر رو دیتا۔
اس وقت تک مجھے مظاہر فطرت کے اس پہلو پر غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ لیکن بعد میں جب کڑک کا یہ خوف ایک دم میرے ذہن سے نکل گیا ————— اور دوسرے لوگوں کو کڑک سے گھبراتا دیکھ کر مجھ میں مسکراتے رہنے کی ہمت پیدا ہو گئی تو ایک بار۔ شاید کالج کے دنوں میں — مجھے یہ خیال آیا کہ کیا انسان کبھی عناصر پر قابض ہو سکے گا؟ پھر جب میں نے طوفان میں اڑتے ہوئے چھپر دیکھے، اور سیلابوں میں گاؤں کے گاؤں کو ڈوبا پایا، اور جب کسی گھر میں بھڑکی ہوئی آگ کے شعلوں کو اوپر ہوا میں تالیاں بجاتے اور ناچتے دیکھا، جب میرا ایک دور کا عزیز بیٹھے بٹھائے آسمان سے گرتی ہوئی بجلی کا شکار ہو گیا۔ جب کوئٹے کے زلزلے میں میرے چند عزیز دوستوں کے رشتہ دار موت کے گھاٹ اتر گئے، اور جب میں نے یہ سنا کہ ان میں بیشتر تعداد بھوک سے بچوں کی تھی، تب عناصر پر انسان کے قابض ہونے کا سوال ایک عزم بن کر میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ مگر ابھرا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ میں بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھا اور خدا کا خوف اس سے آگے کچھ سوچنے ہی نہیں دیتا تھا۔ اور پھر چچا جان مرحوم کا یہ فرمان کہ خدا کے وجود کے بارے میں سوچنا تک کفر ہے۔ وہ ہے۔ بس! وہ کیوں ہے اور کیسے ہے؟ یہ خیال صرف کافر ہی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنی ایک نظم "تذبذب" میں جو "جلال و جمال" میں شامل ہے کہا ہے ؎

خدا وہ کیا ہے سمجھ لے جسے حقیر ادراک
کہاں خرد کی اڑانیں، حریم ذات کہاں
کہاں وہ زندہ و پائندہ حسنِ لا محدود
مرے خیال کے دھندلے تاثرات کہاں

بہت آگے چل کر میرے ذہن میں یہ خیال گھر کر سکا کہ جب انسان بڑے ناز سے ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

کہہ سکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہے ؎

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے!
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے!
وہ ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

دراصل آج میرا جو بھی نظریہ ہے وہ ایک دم میرے ذہن پر چھٹ نہیں پڑا، بلکہ میں نے اسے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بالکل تدریجی یا صحیح لفظوں میں بالکل جدلیاتی انداز میں قبول کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں مذبذب نہیں ہوں، میں مانتا ہوں کہ نظریہ بدلتا رہتا ہے، لیکن اس تبدیلی کا رجحان ارتقائی ہوتا ہے۔ نیچر سے میری ابتدائی معصومانہ محبت اور نیچر کے مظاہر پر قبضہ کرنے کا عزم۔ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فاصلہ ہے لیکن میں اس دوسرے پر کود کر نہیں پہنچا، شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں مجھے اپنا آج کا یہ شعر عزیز ہے کہ ؎

اب کیا ہے فرشتوں کے تعارف کی ضرورت
انسان نے انسان کو پہچان لیا ہے

تو وہاں مجھے اپنے ماضی کی اس یادگار سے بھی نفرت نہیں کہ ؎

الٰہی! خیالوں کے خلوت کدے میں کوئی شعبدہ باز آیا ہے
وہ پردے سے جھانکے، وہ کوئی مسکرایا۔ مجھے ہو بہو تو نظر آ رہا ہے

ہمارے ملک میں طبقاتی شعور تو شاید صرف سائنٹیفک تعلیم ہی سے پیدا ہو سکے اور اپنے مقدر پر راضی برضا ہو کر بیٹھے رہنے اور توکل کے عقیدے پر قناعت کر لینے کی بجائے شاید انسان درجے کی محنت ہی سے چھٹ سکیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ غریبی اور امیری کا خوفناک تفاوت یہاں کے اوسط درجے کے انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کا احساس عموماً دبا ہی ہوتا ہے اور انسان کڑھنے اور اپنے دل کو خون کرنے سے آگے کچھ سوچتا ہی نہیں، لیکن غریبوں اور درمیانی طبقے کے لوگوں کی امیروں سے نفرت ایک ایسی حقیقت ہے جسے نہ مذہبی اخوت آنکھوں سے اوجھل کر سکتی ہے اور نہ مقدر پرستی۔ دیہات میں تو یہ تفاوت اور بھی تیز نظر آتا ہے، شاید اس لیے کہ ہزار ڈیڑھ ہزار کی آبادی میں کل ایک یا دو آدمی ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے پسینے کی کمائی پر سانپ بن کر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے جب پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیے تو مناظرِ فطرت کے حسن اور اسلامی روایات کے طنطنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس معاشرتی اور معیشتی تفاوت نے بھی متاثر کیا اور

میں رومانوں اور خوابوں سے اٹے ہوئے ذہن کا وہ چور دروازہ بند نہ کر سکا جس میں سے آنکھوں دیکھی سفاک حقیقتیں اندر سرک آتی تھیں۔ مگر اس وقت یہ حقیقتیں مجھ پر محض رقت کی کیفیت طاری کر سکتی تھیں اور میں اسی کیفیت کو اپنی کہانیوں میں منتقل کر دیتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے یہ سوچنے کا خیال آیا کہ فلاں غریب ہے تو آخر کیوں غریب ہے؟ فلاں نے اپنی بیٹی بیچ دی تو کیوں بیچ دی؟ فلاں نے چوری کی ہے تو کیوں کی ہے؟ ——————— فلاں بے گناہ نے تھانیدار کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچیں تو کیوں کھینچیں؟ اور فلاں چپکے سے بیگار پر کام کرنے چلا گیا تو کیوں چلا گیا؟ اور جب میں نے سب کچھ سوچا تو ہر حقیقت کے پیچھے مجھے روپوں کی تھیلی چھنچھناتی سنائی دی۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا منکر نہیں ہوں۔ میں ڈاڑھی مونچھیں منڈا دینے یا کوٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اخلاق کی بے حرمتی نہیں گنتا۔ لیکن انسان سے محبت کرنے، خلوص برتنے، سچ بولنے، بے تعصب اور بے ریا بننے، نڈر ہو کر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف برسرِ بازار انگلی اٹھا کر اسے ظالم کہہ دینے کو بہترین اخلاق تصور کرتا ہوں۔ اور جب میں علی الاعلان سچ بولتا ہوں تو مجھے انسان کی روح کائنات پر پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ بہرکیف اخلاقی اور روحانی قدروں کا احترام کرتے ہوئے بھی میں نے یہی محسوس کیا کہ اگر انسانی طبقوں کا یہ تفاوت ختم ہو جائے، یا اگر ایسا ہو کہ کوئی انسان کسی انسان کا محتاج نہ رہے اور ہر انسان محض اپنے لیے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے اچھے اچھے کام کرے، اور آدمی اپنی انفرادیت کو اس ڈھب پر پروش کرے کہ اس کے تہِ نظر بحیثیت اجتماعی مفاد ہو تو جینے کا لطف آ جائے۔ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں اپنے ملاتے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا محض اسی بنا پر کیا کہ ہمارے رہنماؤں کی تقریروں میں انسانی مساوات کی بشارتیں آباد ہوتی تھیں اور وہ لٹھا پہنتے تھے اور ہمارے دیہاتی کارکنوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور جلسہ گاہ میں پہنچ کر اپنے چہرے پر سے سفر کی دھول نہیں پونچھتے تھے۔ میرا سیاسی شعور ناپختہ تھا، اس لیے میں دور تک نہ دیکھ سکا۔ اپنی ناک سے ذرا سا آگے دیکھ لینے کی ہمت بڑی آزمائشوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

میں پشاور ریڈیو اسٹیشن میں پاکستانی نغمے لکھ رہا تھا جب ایک پروگرام اسسٹنٹ نے ریڈیو اسٹیشن کی چھت پر چڑھ کر اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کیے اور اسٹیشن ڈائرکٹر نے سبز جھنڈا کھول دیا۔ یہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ تھی اور اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ دنوں تک میں سرشاری کے عالم میں رہا۔ اور پھر ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے میں نے سڑک پر ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں دیکھیں اور بعد میں یہ بھی دیکھا کہ غیر مسلم عورتیں کپڑوں کی گٹھریوں کی طرح تانگوں میں ٹھونس کر بھگائی جا رہی تھیں اور میں نے ایک جلتے ہوئے گھر میں ایک بچے کی چیخیں سنیں اور پھر جب پشاور شہر میں ہندوؤں کے محلے کو آگ لگا دی گئی تو میں صدر پشاور میں حواس باختہ کھڑا کچھ سوچ رہا تھا جب ایک دوست کی ننھی سی لڑکی میرے پاس بھاگی آئی۔ مجھ سے چمٹ گئی اور روتے ہوئے بولی: "چچاجان، وہ دیکھیے آسمان جل رہا ہے!"

آسمان جل رہا تھا۔ بچی نے غلط نہیں کہا تھا۔ آسمان جل گیا اور اس کی بجھی ہوئی راکھ اپنی پر آ گری جنھوں نے اسے، یا اسلامی دکھائی تھی۔ میرے ذہن میں دھڑاکے سے ہونے لگے۔ ملک کی سیاسی صورتِ حال نے مجھے قدم قدم پر جکڑا ڈالا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہم کہاں جا کر رکیں گے۔ اس وقت میں نے یہی استفہامیہ ایک رباعی میں منتقل کر دیا تھا ؎

کیا اپنا سراغ خود نہیں پاؤ گے؟
کیا پھر کوئی اجنبی بلا لاؤ گے؟

یہ راہ تو اس موڑ پر مڑ جائے گی
اے اہلِ وطن کہو، کہاں جاؤ گے

امیر تیمور کے انصاف اور شہنشاہ اورنگ زیب کی نرم دلی اور عدل گستری اور بنو امیہ اور بنو عباس کے دور کے بغداد کے امن و سکون کے بارے میں اب مجھ سے ریڈیو فیچر نہیں لکھے جا سکتے تھے، میرا ایک ڈرامہ "شکست و فتح" ریڈیو پر خاصا مقبول ہوا ہے۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ میں نے تیموری خوفناک شخصیت کو عدل و انصاف کے تخت پر بٹھاتے ہوئے اپنے ضمیر کی کتنی پکاروں کا گلا گھونٹ دیا۔ میں آج بھی حضرت عمرؓ کا قصیدہ تک لکھنے کو تیار ہوں، میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زہد و اتقا کا معترف ہوں اور ٹیپو کی وطن دوستی سے پیار کرتا ہوں۔

لیکن جب مجھے دارا شکوہ پر ایک فیچر لکھنے کا حکم ملا اور میں نے اس فیچر میں اورنگ زیب کے مظالم کو ذرا واشگاف انداز میں بیان کیا تو "لسنر" چیخ اٹھے اور مجھ سے جواب طلبی کر لی گئی۔ میں اپنے وطن کے گیتوں اور رقصوں کی کہانیاں پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے وطن کے لوگوں کی امنگوں اور ولولوں کی تصویریں کھینچنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہر روز نئے سے نئے فیچروں کے ذریعے اپنے رہنماؤں کو اُن کے وعدے یاد دلاتا رہوں مگر جب میں نے ان اوروں میں اپنے قلم کی نوک کو مڑا ہوا پایا اور میں پشاور سے بھاگ آیا اور لاہور میں آکر میں نے بہت کچھ لکھا اور اگرچہ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے ندامت سی محسوس ہوتی ہے، مجھ پر اور دوسرے ترقی پسند مصنفین پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نئے وطن کی مصلحتوں سے آنکھیں پھیر کر اندھا دھند لکھا، لیکن کم از کم میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا وہ ذرا سا ڈر ڈر کر ہی لکھا۔ ورنہ اگر حکومت کے عتاب کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے ذی اقتدار طبقے کو نہایت کریہہ قسم کے ناسور اور نہایت گھناؤنے انداز کے زخم دکھانا تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ اِدھر بھی متوجہ ہوں۔ یہی تعمیری تنقید ہے۔

لیکن میں نے جھجک جھجک کر بھی جو کچھ لکھا اُس نے مجھے آخر کار جیل میں لا ڈالا۔ جیل پہنچنے تک میں یہی سوچتا رہا کہ مجھے یہاں کیوں بھیجا گیا ہے، مجھے تو ابھی اپنا وہ شہ پارہ لفظوں میں منتقل کرنا ہے جو ذی اقتدار جماعت کی ناراضی کا صحیح جواز بن سکتا ہے۔ میں تو ابھی تک کھل کر بات کہنے کا انداز ہی سیکھ رہا تھا۔

اور یہاں پہلے تو میرے ہم وطنوں نے ہی مجھ پر تہمتوں کی بوچھار کر دی اور اس کے بعد ایک خوش گوار صبح کو میرے گھر کے دروازے پر پولیس کے ایک انسپکٹر نے کہا: "یو آر انڈر اریسٹ!" —

تو کیا اپنا شہ پارہ لکھ کر مجھے پھانسی کا منتظر رہنا چاہیے۔!؟

یہ چند بکھری ہوئی یادیں تھیں، جو اپنی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ادب کے پس منظر کو ذرا سا واضح کر دینے کے لیے میں نے مدیر "ماحول" کے ارشاد کی تعمیل میں قلم بند کر دیں۔ میں نے ابھی کچھ بھی تو نہیں لکھا، چند نظمیں، چند غزلیں اور چند کہانیاں لکھ کر میں اپنے ان فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو گیا جو ہر باشعور اور غیرت مند انسان کی طرح مجھے بھی تفویض ہوتے ہیں۔ میں ادب اور فن کی شاہراہ کا ایک مسافر ہوں، بہت دور کا سفر کرنے کے ارادے ہیں، اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکا۔ زندگی کا حسن اور کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت! — یہ اور بے شمار دوسری باتیں ابھی میرے ذہن میں

پک رہی ہیں، تکمیل کا دعویٰ فن کی توخیر نہیں، فن کار کی موت ضرور ہے ، اسی لیئے اپنے آپ کو طالبِ علم کہنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور مزید جستجو کا ذوق تازہ ہوتا ہے۔

چھتیس برس کا ہونے کو آیا ہوں، شادی شدہ ہوں، دو بیٹیاں ہیں، ایک کا نام ناہید ہے اور ایک کا نشاط ، معاش کی مصیبتیں بے شمار ہیں، مگر اب مجھے مصیبتوں سے بھڑتے رہنے اور بھڑتے ہوئے مسکراتے اور ہنستے رہنے کا ڈھب آگیا ہے ، اس لیئے بڑے مزے سے زندہ ہوں۔

SOLE DISTRIBUTORS

SAKAR PUBLISHERS PVT., LTD.
107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضاؔ
مدیر
صابر دت